حضرت امام احمد بن حنبلؒ

جناب عبدالرشید عراقی

نام و نسب نام احمد بن محمد بن حنبل، کنیت ابوعبداللہ۔ ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ تین سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

تحصیلِ علم بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا۔ بغداد جسے حضرت امام کے مولد و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہیں سب سے پہلے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ بغداد خلافتِ عباسیہ میں بہت بڑا علم و فن کا مرکز تھا۔ اس کے بارے میں محدث حاکم نیشاپوری فرماتے ہیں "بغداد مدینۃ العلم" اور "موسم العلماء والافاضل" ہے[۱]۔

بغداد میں آپ کے استاد حضرت امام ابو یوسفؒ، اور امام حدیث ہیثم بن بشیر بن ابو حازمؒ الواسطی م ۱۸۳ھ ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر محدثین کرام سے بھی استفادہ کیا۔ بغداد سے فارغ ہو کر کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے علم حاصل کیا[۲]۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی ملاقات حضرت امام شافعیؒ سے ہوئی۔ امام احمدؒ اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے۔ امام شافعیؒ حدیث کے صحت و سقم کے بارے

۱۔ معرفۃ العلوم الحدیث ص ۱۹۴

۲۔ مناقب الامام احمد بن جوزی ص ۲۲

میں اکثر اُن پر اعتماد کرتے۔ فرماتے کہ اگر محدثین کے یہاں حدیثیں صحیح ہوں تو تم مجھے بتلا دیا کرو، میں اُن کو اختیار کروں گا۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل کا حافظہ قوی تھا۔ دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود حضرت امام شافعیؒ کی شخصیت سے متاثر تھے اور کہتے تھے "مارأت عیناي مثله" (میری آنکھوں نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا)۔ اور حضرت امام شافعیؒ امام احمدؒ بن حنبل کے بارے میں فرماتے ہیں:

خرجتُ من بغداد وما خلفتُ بها اتقی ولا افقہ من احمد بن حنبل[1]

ترجمہ:۔ میں بغداد کو چھوڑ رہا ہوں۔ اس حالت میں کہ وہاں احمدؒ بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے، نہ کوئی فقیہ۔

مجلسِ درس چالیس سال کی عمر میں (غالباً ۲۰۴ھ) انہوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ یہ بھی اُن کا کمال اتباعِ سنت تھا کہ انہوں نے عمر کے چالیسویں سال، جو سنِ نبوت ہے، علمِ نبوت کی اشاعت شروع کی۔ ابتداء ہی سے اُن کے درس میں سامعین وطالبین کا اژدحام ہوتا تھا۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ اُن کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی۔ ان میں پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے۔ اُن کی مجلسِ درس بڑی سنجیدہ اور باوقار ہوتی تھی[2]۔

زہد وتقویٰ امام صاحب کی زندگی زہد وتوکل میں یکتائے روزگار تھی۔ انہوں نے کبھی بھی سلاطین و امراء کے عطیات قبول نہیں کیے۔ مامون، معتصم، اور واثق کا دور اُن کے لیے اس حیثیت سے آزمائش تھا کہ یہ تینوں اُن کے درپے آزار رہے۔ ان کے بعد متوکل کا دور اس لیے آزمائش تھا کہ وہ ان کا نہایت عقیدت مند اور قدر دان تھا۔ امام صاحب نے متوکل کے حکم سے اس کے لشکر میں قیام فرمایا۔ اس عرصہ میں شاہی مہمان تھے۔ روزانہ پر تکلف کھانا آتا۔ مگر امام صاحب نے اس کھانے کو کسی روز

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۸

[2] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ ص ۱۶۵

بھی نہیں چکھا۔ وہ مسلسل روزہ رکھتے۔ یہاں تک کہ اتنے ضعیف اور کمزور ہو گئے کہ اگر ان کو رخصت نہ ملتی تو شاید زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔[۱]

ایک مرتبہ مصر کے ایک کرم فرما نے ہزاروں دینار یہ کہہ کر بھیجے کہ یہ بالکل حلال ترکۂ میراث ہے، اس کو قبول فرمایئے اور اپنے بچوں پر خرچ کیجیے۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔

گرچہ گرد آلود فقرم شرم بادا ز ہمتم
گر بآب چشمۂ خورشید دامن تر کنم

تواضع و مسکنت مسئلۂ خلقِ قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالمِ اسلام اُن کی شہرت سے معمور ہو گیا اور ہر طرف اُن کی تعریف اور دعا کا غلغلہ تھا۔ مگر وہ برابر اللہ سے خائف رہتے۔

امام یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں:-

"میں نے امام احمدؒ جیسا نہیں دیکھا۔ میں پچاس برس اُن کے ساتھ رہا۔ انہوں نے کبھی ہمارے سامنے اپنی صلاح وخیر پر فخر نہیں کیا"۔[۲]

شیوخ و تلامذہ حافظ ابن جوزی نے آپ کے شیوخ کی تعداد سو سے زیادہ بتائی ہے جیسے امام ابو یوسفؒ، ہیثم بن بشیر بن حازم، وکیع، یحییٰ بن سعید، قطان، سفیان بن عیینہ، امام شافعیؒ وغیرہ۔

ان کے تلامذہ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرہ (جلد ۵ - ص ۸) میں لکھا ہے کہ "بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعہ، لطیف وعبداللہ بن احمد وخلق عظیم"۔

خلقِ عظیم (یعنی کثیر التعداد خلقت) کے الفاظ سے ان کے تلامذہ کی کثرتِ تعداد کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بڑے بڑے ائمۂ فن شامل ہیں۔

امام احمد ابتلاء و امتحان میں ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اُن کے ابتلاء کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ کیونکہ خلقِ قرآن کے مسئلہ میں انہوں نے غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیا۔ بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں معتزلہ کا زور تھا۔ اور معتزلہ نے اس مسئلے کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا تھا۔ وقت کا

---

[۱] طبقات الحنابلہ
[۲] حلیۃ الاولیاء - جلد ۹ ص ۱۸۱

فرمانروا مامون بھی اس مسئلہ کا پرجوش داعی بن گیا۔ اور اس کے ساتھ قاضی احمد بن دُؤاد بھی شامل ہوگیا۔

ابتداء میں بہت سے علمائے کرام نے نظریۂ خلقِ قرآن کی مخالفت کی۔ حکومت کی طرف سے سختی سے نوٹس لیا گیا۔ کئی علماء حکومت کی سختی برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے حکومت کی بات مان لی۔ مگر امام احمد بن حنبل آخر تک ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جب حکومت ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر چکی اور اُس کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو پھر وہ انتہائی تشدد پر اُتر آئی۔

حضرت امام کو دربار کے حکم سے کوڑے لگائے گئے۔ ایک تازہ دم جلّاد صرف دو کوڑے لگاتا، پھر دوسرا جلّاد بلایا جاتا۔ امام احمدؒ ہر کوڑے پر فرماتے۔

اعطونی شیئًا من کتاب اللّٰہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ۔

ترجمہ: میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اُس کے رسول کی سنّت میں سے کوئی دلیل پیش کرو۔ تاکہ میں اُس کو مان لوں۔

امام احمد کو ۲۸ ہفتے قید خانے میں رکھا گیا۔ اور اس عرصہ میں اُن کو ۳۴ کوڑے لگائے گئے۔[1]

امام محمدؒ بن اسمٰعیل بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے سُنا کہ امام احمد بن حنبل کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی کو لگتا تو چیخ مار کر بھاگتا۔ امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اور امتِ اسلامیہ ایک بہت بڑے دینی خطرے سے محفوظ ہوگئی۔ ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز دین کی حفاظت کے لیے اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہت کا تنہا مقابلہ ہے۔[2]

حضرت امام علی بن مدینی جو مشہور محدث اور امام بخاری کے مایۂ ناز اُستاد ہیں۔ انہوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی۔ فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۳۳۲ د تاریخ دعوت وعزیمت بحوالہ تاریخ اسلام از ذہبی۔
[2] تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۴۱۸

ان اللہ اعز ھذا الدین برجلین لیس لہ ثالث۔ ابوبکرن الصدیق یوم الردۃ واحمد بن حنبل یوم المحنۃ ۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کے غلبہ و حفاظت کا کام دو شخصوں سے لیا جن کا تیسرا ہمسر نظر نہیں آتا۔ ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور فتنہ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ[۱]

تصنیفات صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کی درج ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے:۔

۱۔کتاب الزہد۔ ۲۔کتاب الناسخ والمنسوخ۔ ۳۔کتاب التمسک الکبیر۔ ۴۔کتاب التمسک الصغیر ۵۔کتاب حدیث شعبہ۔ ۶۔کتاب فضائل الصحابہ۔ ۷۔ مناقب صدیق اکبر و حسنین، ۸۔کتاب الاشربہ۔ ۹۔ تاریخ تفسیر۔ ۱۰۔مسند احمد بن حنبل۔

ان کی یہ تصانیف بڑی علمی و تصنیفی کارنامہ ہیں۔

مسند احمد کی تالیف مسند آپ کی زیادہ مشہور کتاب ہے۔ ۱۸۰ھ میں اپنی تصنیف کا آغاز کیا۔ اور آخر زندگی تک اُس کی تصنیف میں مشغول رہے۔ مسند میں تقریباً ۷۰۰ صحابہ کی روایات ہیں۔ روایات کی تعداد تیس ہزار بتائی گئی ہے۔ عبداللہ کی زوائد کا شمار کیا جائے تو تعداد چالیس ہزار بن جاتی ہے جتنا بڑا احادیث کا یہ ذخیرہ ہے، اس سے بڑا اور کوئی ذخیرہ نہیں ہے[۲]

اجتہاد اور فتویٰ کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا نقطۂ نظر اجتہاد و فتویٰ کے بارے میں ان کے سامنے پانچ بنیادی اصول رہے:۔

۱۔ جب نص صحیح موجود ہو تو پھر بڑے سے بڑے صحابی کے اختلاف کے باوجود نص پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ کئی مسائل میں انہیں حضرت عمرؓ سے اختلاف کرنا پڑا۔ جیسے مہر کا معاملہ ہے۔ اس میں فاطمہ بنت قیس کی روایت واضح ہے۔ اسی طرح جُنبی کے تیمم کے باب میں وہ عمار بن یاسر کی روایت کردہ حدیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ مُحرِم نے اگر احرامِ مکہ سے پہلے خوشبو استعمال کی ہے اور

---

[۱] تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۴۱۸

[۲] تدریب الراوی ص ۴۰ و طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۰۲

کے اثرات قائم رہتے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ سے ان معنوں میں حدیث موجود ہے ۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے اس فتوے سے انہوں نے اختلاف کیا کہ حاملہ جس کا خاوند مر چکا ہو، اُس کی عدت اقصی الاجلین ہے ،کیونکہ اُن کے نزدیک سبیعۃ الاسلمیہ کی حدیث زیادہ قابلِ اعتبار ہے ۔ ٹھیک اسی نہج کی مخالفت توریثِ مسلم از کافر کے باب میں انہیں حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت معاذ رضؓ سے ہے ۔ یہ دونوں بزرگ اس کے قائل نہیں ۔اور امام چونکہ اُس حدیث کو صحیح مانتے ہیں جس میں اُن کی مخالفت کا تذکرہ ہے اس لیے اس کے قائل نہیں ہو سکتے ۔غرض نصِ صریح کے ہوتے ہوئے امام نے کبھی مختلف آرا کی طرف نظر اُٹھا کے نہیں دیکھا ۔ حدیث کے مقابلہ میں قیاسات و آرا ، کو اہمیت نہیں دی ، اگرچہ عام لوگ انہیں اجماعِ امت سے تعبیر کریں ۔کیونکہ اس میں حقیقت صرف اتنی ہوتی ہے کہ ہمیں اختلاف کا علم نہیں ہو پاتا ۔ یعنی ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ہمیں اُن لوگوں کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا جنہوں نے اختلاف رائے کیا ہو ۔لہٰذا نصوص کے ہوتے ہوئے ہمیں دوسرے کی رائے کو نہیں دیکھنا چاہیے۔

۲ - انہیں جب کسی صحابی کی رائے معلوم ہوتی اور یہ نہ معلوم ہو پاتا کہ کون کون اس کا مخالف ہے تو صرف اس قدر فرماتے کہ اس مسئلہ میں فلاں صحابی یا صحابہ کی رائے یہ ہے ،اس کی مخالفت معلوم نہیں ۔اس پر اجماع کا دعویٰ نہ کرتے ۔پھر اس کو ہر رائے اور ہر قیاس پر مقدم ٹھہراتے۔

۳ - جب مختلف صحابہ کی آرا سامنے آتیں تو اُن میں سے جو کتاب و سنت کے اقرب رائے ہوتی اُسے قبول فرماتے ۔ ہر آئینہ اپنے کو صحابہ کے اقوال میں محصور رکھتے ۔ پھر اگر کسی مسئلہ میں موافقت واضح نہ ہوتی تو احتیاط سے کام لیتے ۔اور کسی قول کو قطعی نہ سمجھتے ۔

۴ - مرسل کو حجت گردانتے - اسی طرح ضعیف حدیث سے بھی استدلال کرتے ،جب کہ کوئی اور مانع نہ ہوتا اُسے قیاس پر مقدم ٹھہراتے ۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ امام کے نزدیک ضعیف حدیث سے مُراد منکر یا باطل نہیں ہے بلکہ وہ قریب قریب حَسَن کے مترادف ہے ۔کیونکہ اُن کے نزدیک احادیث کی تقسیم یُوں ہے کہ یا تو وہ صحیح ہیں یا ضعیف ، درمیانی مراتب مفقود ہیں ۔اِس لیے جو مرتبۂ علیا کی حدیث ہے وہ صحیح ہے اور جو مرتبے میں اس سے کم ہے وہ ضعیف ہے ۔ وہ اس کو اس شرط کے ساتھ حجت مانتے ہیں کہ اس کی مخالفت میں کسی صحابی کا قول یا اثر نہ ہو ۔ اس باب میں دوسرے ائمہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے ۔

جیسے امام ابوحنیفہؒ کہ انہوں نے بعض مقامات پر اُن ضعاف سے استدلال فرمایا ہے جن کے ضعف پر ائمہ حدیث متفق ہیں جیسے قہقہہ فی الصلوٰۃ کی حدیث یا نبیذِ تمر سے وضو کی حدیث یا مثلاً ایامِ حیض کی تحدید کے متعلق یہ تصریح کہ "اکثر الحیض عشرۃ ایام" (یعنی مدتِ حیض دس دن ہوتی ہے)، یا مہر کے تعین سے متعلق یہ حدیث کہ "لا مہر اقل من عشرۃ دراھم" (ترجمہ۔ دس درہم سے کم مہر نہیں)۔

۵۔ قیاس و اجتہاد کو اس وقت کام میں لاتے جب یہ دیکھتے کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں ہے یعنی پہلے نصوص کو ٹٹولتے اور پھر صحابہ کے اقوال کی جستجو ہوتی۔ مرسلات و ضعاف تک کو قیاس پر مرجح سمجھتے۔ پھر جب دیکھتے کہ بغیر قیاس و رائے کے اب مسئلہ نہیں سلجھتا تو پھر اس کو استعمال کرتے۔ اکثر فرماتے کہ میں اس معاملے میں شافعی کا پیرو ہوں۔ اُن سے سبب دریافت کیا گیا کہ قیاس و رائے استعمال کرنا چاہیے تو انہوں نے فرمایا کہ "انما یصار الیہ عند الضرورۃ" یعنی جب اور کوئی صورت باقی نہ رہے، تب اس کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔[1]

مناقب حضرت امام کے مناقب پر علماء نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ آپ ایک بلند پایہ فقیہ، محدث، مجاہد، زاہد، مرتاض، عاملِ سنتِ نبویؐ تھے۔

مسلک ان کا مسلک کتاب و سنت کے نقطۂ نظر سے اتنا اقرب، اتنا صحیح اور قیاس و رائے کو اتنا کم لیے ہوئے ہے جس کی مثال دوسروں میں نہیں ملتی۔

دوسری خصوصیت اُن کی بے نظیر عزیمت ہے کہ مسئلہ خلقِ قرآن میں باوجود جلالتِ قدر کے تذلیل و تعذیب کی تمام صورتوں کو گوارا کیا۔ لیکن جس کو حق سمجھتے تھے اُس پر جمے رہے، اس سے دستکش نہیں ہوئے۔

وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو امامِ سنت نے انتقال کیا۔ آپ کی نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں اور اُن کی وفات کے موقع پر بیس ہزار غیر مسلم اسلام کی چوکھٹ پر جھک گئے۔[2]

---

[1] ملخص از امام احمد بن حنبل از شیخ ابوزہرہ مصری۔

[2] تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۸